سہ ماہی
آئندہ
کراچی
مدیر
محمود واجد

جلد:۹ شمارہ: ۳۶-۳۵
اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۴ء

سہ ماہی

کراچی

مدیر: محمود واجد

رابطہ: ہاشمی ٹریڈنگ، اودھوداس روڈ، عقب الیکٹرک مارکیٹ، آرام باغ، کراچی ۔۷۴۲۰۰ (پاکستان)

ای۔میل: aaindahkarachi@yahoo.com
فیکس: 092-21-2214040
فون: 2626516, 2624040
موبائل: 0300-2244866

جلد:۹ شمارہ: ۳۶-۳۵
اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۴ء

سہ ماہی

کراچی

مدیر: محمود واجد
معاون مدیر (اعزازی): سائرہ غلام نبی

مدیر انتظامی: ممتاز ہاشمی

کیلی گرافی: صابر حسین

آرٹ ورک: آصف جمیل

طابع: محمد علی
احمد برادرز، 16-11/B
ناظم آباد، کراچی

ناشر: واجد ہاشمی

D-106, Asma Garden,
Off: A.H.Isphahani Road,
Opp: Journalist Society,
Karachi-75330
Pakistan
Ph: 8140468

فی شمارہ: ۵۰روپے صفحات: ۱۶۰
سالانہ قیمت: ۲۰۰روپے (چار شمارے)

بیرون ملک:

بھارت/ بنگلہ دیش: (علاوہ ڈاک خرچ) ۲۲۰روپے
سعودی عرب: (بشمول ڈاک خرچ) ۱۰۰ریال
متحدہ عرب امارات: (بشمول ڈاک خرچ) ۱۰۰درہم
یورپی ممالک: (بشمول ڈاک خرچ) ۱۵ پونڈ
امریکہ/ کناڈا: (بشمول ڈاک خرچ) ۲۵امریکی ڈالر
دیگر ممالک: مساوی ۲۵امریکی ڈالر

قیمت خصوصی شمارہ: ۱۲۰ روپے صفحات: ۳۲۰

دفتر: ہاشمی ٹریڈنگ، اودھوداس روڈ، عقب الیکٹرک مارکیٹ، آرام باغ، کراچی ۔ ۷۴۲۰۰

تفصیل

تحریریں	صفحہ	قلم کار
اظہار		
ہم کہاں نہیں ہوتے؟	۷	ادارہ
عقیدت		
حمد	۹	رفیع الدین راز، یعقوب تصور
حمد	۱۰	ظفرالحق چشتی، فرحت آراء
نعت	۱۱	راہی فدائی
نعت	۱۲	آذر حفیظ، حسن نظامی
ترسیل		
فکشن کی تنقید کے بعض رویے	۱۳	حنیف فوق
مکالمہ اپنے عہد سے	۲۵	جوگندر پال
قاضی عبدالودود اور افسانوی ادب	۳۶	مظہر امام
فکشن کی شعریات کا پہلا مرتب: عبالقادر سروری	۴۲	ابوبکر عباد
عصری ناول نگاری	۵۲	رضی مجتبیٰ
''گینڈا'' یا ''آخری آدمی''	۵۸	ناصر بغدادی
اسد محمد خاں-ایک غیر معمولی افسانہ نگار	٦٦	انوار احمد
جدید اور مابعد جدید فکشن: ایک مثال	۷۱	فہیم اعظمی
منٹو شناسی: ایک تقابلی مطالعہ	۷٦	اے۔خیام
جدید اردو ناول: چند سرسری تاثرات	۸۳	مبین مرزا
دہشت کے موسم میں کہانی کا چلن	۱۰۴	محمد حمید شاہد
ناول کی تفہیم وتعبیر کی دشواریاں	۱۱۰	ممتاز احمد خاں
۱۹۹۰ کے بعد کا اردو فکشن: ہندوستان میں	۱۱۵	مشرف عالم ذوقی
معروف اردو ناولوں کے بعض کرداروں میں زندگی	۱۲۸	سائرہ غلام نبی
فکشن میں روح کی بازیافت: ابتدائیہ	۱۳۷	محمود واجد
نظمیں		
اے خدا اے خدا	۱۴۴	حسن عابدی
درخت بوڑھے اور آدمی	۱۴۵	ادیب سہیل
سیاہ خانہ/کولاژ	۱۴٦	وحید الحسن

حنیف فوق

فکشن کی تنقید کے بعض رویے

فکشن کی تنقید ادبی تنقید سے الگ نہیں ہے۔ کیوں کہ دونوں میں ایک ایسی فکر کی ضرورت ہے جو زندگی پر محیط ہو اور جس میں احساسات، اقدار اور تصورات کی فلسفیانہ تعبیر کا سلسلہ جاری رہے۔ البتہ ادب کی ایک متوازی دنیا بھی ہے، جس کا انفرادی ذہانت، ادبی روایات اور جمالیات سے گہرا تعلق ہے۔ پھر ہر صنف ادب کے اپنے تقاضے بھی ہوتے ہیں۔ ادب کی متوازی دنیا کے لیے ان کی پاس داری بھی لازم ہو جاتی ہے۔ ہر اہم لکھنے والا بعض روایات کو جذب کرتا اور بعض کو توڑتا ہے۔ ادبی اظہار اور پیرایۂ اظہار میں بھی یہ فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔ مثلاً شاعری میں جن اوصاف کی ضرورت پڑتی ہے جیسے مبالغہ، حسن تعلیل، حسن تکرار، صوتی مناسبات اور لفظی و معنوی رعایات۔ فکشن میں ان سے زیادہ کام نہیں لیا جاتا۔ یہ سمجھنا بھی غلط ہوگا کہ شاعری بیان کردہ یا اس قبیل کے عناصر تک محدود ہے۔ اسی غلط فہمی نے شاعری کی غلط تعبیر کی راہ نکالی ہے۔ دیکھا جائے تو فکشن کا دامن بھی ان عناصر سے خالی نہیں رہتا۔ البتہ فکشن میں ان سے زیادہ کام نہیں لیا جاتا۔ فکشن کے بعض لکھنے والوں نے (مثلاً سومر سیٹ ماہم) نے تو اپنے تجربات کی روشنی میں صفات (Adjectives) کے استعمال سے بھی گریز کیا ہے۔ لیکن زندگی کی گرفت اور انسانی اقدار کی جامعیت شاعری اور فکشن دونوں کے نمایاں اوصاف رہے ہیں۔ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاروں یا افسانے کے نقادوں نے کسی ایک صورت کو جو ان کے خانۂ دل سے زیادہ قریب ہو، زیادہ اہمیت دی ہے۔ کیوں کہ انسانی اعمال کا تجزیہ نہایت کٹھن کام ہے۔ مثال کے طور پر فرانسیسی فطرت نگاروں نے مجموعی زندگی کی بجائے "زندگی کی تلاش" کا نظریہ پیش کیا۔ اس کے باوجود جب تک کسی نہ کسی طور پر مجموعی زندگی کی کیفیت اور اس مجموعی زندگی میں افراد و طبقات کے اعمال، تصورات کی نشان دہی نہیں ہوتی تو کوئی بھی ادبی نمونۂ فن کی عظمت کے مدارج سے دور رہتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر زندگی کی گرفت صحیح ہو تو اس میں انسانی تاریخ اور بنتے یا بنائی جانے والی تاریخ کی مستقبلیت کے رنگ بھی جھلکنے لگتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو فکشن یا فکشن کی تنقید کے رویے ہی ایک دوسرے پر اثر انداز نہیں ہوتے بلکہ مجموعی ادبی اقدار سے بھی ان کی تخلیقی قوت کا اندازہ ہوتا ہے چنانچہ مرزا محمد عزیز لکھنوی نے اپنی شاعری کے بارے میں جو کہا تھا کہ "قوت ابداع ہے، جو شعر میں میرے عزیز" وہ فکشن اور فکشن کی تنقید کے رویوں پر بھی درست آتا ہے اس لیے فطرت نگاری سے زیادہ، انسانی فطرت، زور تخلیق اور انسانی فطرت کے تاریخی عوامل زیادہ اہم بن جاتے ہیں۔ چنانچہ فکشن سے معلومات، فلسفے یا فہم و دانش کا اظہار نہ ہو، تو بھی اسے انسانی فہم و دانش سے زیادہ دور نہیں

ہو چکا ہے۔ انسان کی ماضی اور تاریخی زندگی بھی انسانی عمر کا حصہ ہیں۔ چنانچہ فکشن بھی انسانی فطرت کی مختلف جہات اور تاریخ کا مظہر بن جاتا ہے۔

خرابی صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب ہم تاریخ کو مسخ کرنے یا نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسی ہی ایک کوشش کی مثال کے طور پر انتظار حسین نے پیش کیا۔ جب وہ اردو افسانے کو مغرب کی تقلید کرتے ہوئے اس کا رشتہ داستانوں یا حکایتوں سے جوڑنا چاہتے ہیں۔ اس سے پہلے وہ تہذیبی حسن اور ماضی کے لیے نئی نسل کا نعرہ لگا چکے تھے (اب تو شاید وہ خود بھی پرانی نسل سے تعلق رکھتے ہیں)۔ انتظار حسین نے بعض خوب صورت اور بعض نہایت کامیاب افسانے بھی لکھے ہیں۔ اردو میں مغرب کا اثر حالات کی تبدیلی کے ساتھ آیا اور یہ صرف افسانے یا ناول پر ہی نہیں پورے اردو ادب پر ہوا اور تمام اصناف ادب میں سرایت کر گیا۔ لیکن بعض کامیاب افسانوں کے باوجود انتظار حسین کا فکشن میں ماضی پرستی اور ماضی کا ذکر جس حسرت آمیز انداز سے ملتا ہے، وہ بیزار کن ہے۔ وہ فکشن کی قائم کردہ روایت سے منحرف ہیں۔ لیکن اپنا ناول ''آگے سمندر ہے'' لکھتے ہوئے بھی وہ حقیقت کی گرفت تاریخ اور شعور عصر سے خالی رہ کر جیتے جاگتے کردار پیدا کرنے سے قاصر رہے۔ اس کے برخلاف پریم چند کی حقیقت نگاری مسلسل ارتقائی دریافت کی حامل رہی ہے اور رومانیت یا اصلاحی رجحان سے لے کر سماجی حقیقت نگاری تک پریم چند نے کئی منزلیں طے کی ہیں۔ انتظار حسین نے تاریخ کے تعلق سے کچھ افسانے ضرور لکھے ہیں اور ان میں ان کی ہنرمندی بھی جھلکتی ہے۔ لیکن تاریخ اور ادبی تاریخ کو رد کر کے شاید سب سے زیادہ نقصان خود اپنے فن کو پہنچایا ہے کہ اس میں زندگی کے حقائق کا سامنا کرنے اور آگے بڑھنے کی طاقت نہیں رہی ہے۔ خود پریم چند نے داستانی رنگ بھی اختیار کیا اور ماضی پرستی سے بھی کام لیا تھا۔ لیکن وہ جلد ہی زندگی کے تجربات و حقائق اور اپنے دور میں رونما ہونے والی آویزشوں کو اپنے فن کا جزو بنانے میں کامیاب ہوئے۔ اس سے ان کے فن میں بلندی آئی اور ان کے کردار زندہ کردار بن گئے۔

ڈی ایچ لارنس نے صنعتی زندگی کے خلاف بھرپور احتجاج کیا اور پورے آدمی کے تصور سے اپنی فکر کو روشناس کرایا۔ وہ اپنے ایک مقالے ''ناول کیوں اہمیت رکھتا ہے'' میں کہتا ہے کہ ''زندگی کے سوا کوئی چیز اہم نہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں زندگی کو زندہ ہستیوں کے اندر ہی دیکھ سکتا ہوں، وہ مطلق نہیں اور زندگی کا سب سے بڑا مظہر زندہ شخص ہے۔ یوں تو بارش میں گوبھی کا پھول تک زندگی کا حامل ہوتا ہے اور جتنی بھی زندہ چیزیں ہوتی ہیں سب حیران کن ہوتی ہیں اور جتنی بھی مردہ چیزیں ہیں، زندہ چیزوں کا ضمیمہ ہوتی ہیں۔ مردہ شیر سے زندہ کتا بہتر ہے۔ مگر زندہ کتا ہونے سے زندہ شیر ہونا بہتر

ہے۔ یہی زندگی ہے۔ (فکشن... فن اور فلسفہ: ڈی ایچ لارنس کے منتخب مقالات کا ترجمہ از مظفر علی سید۔ ص ۳۵ - ۱۹۸۶ء) تاریخ کے رد کرنے کے بہت سے تقاضات ہیں۔ ان میں مٹی ہوئی تہذیب سے دل بستگی کے علاوہ کرداروں کا حقیقی زندگی سے دور ہو کر محض علامت یا تمثیل بن جانا بھی شامل ہے۔ راجندر سنگھ بیدی نے ہندی اساطیر سے بھی کام لیا ہے۔ لیکن ان کی فنی گرفت زندگی کی حقیقتوں کو نمایاں کرتی اور جیتے جاگتے زندہ کردار پیدا کرتی ہے، پھر کتابوں کی چھاپ اشاعتوں کے بارے بھی انتظار حسین کی ادبی فکر کو مشکل کردیا ہے کہ اس میں میر کے "جہان دیگر" سے ملاقات نہیں ہوتی۔ (سرسری ہم جہان سے گزرے۔ ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا۔ میر) اور ایسی ملاقات کے امکانات بھی کم ہوتے جاتے ہیں۔

خود افسانہ نگاروں نے بھی ادب کے بارے میں بعض خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان میں پریم چند، کرشن چندر، منٹو، احمد ندیم قاسمی، قرۃ العین حیدر، عزیز احمد، انتظار حسین اور ممتاز شیریں کی نمایاں حیثیت ہے۔ اپنی تصور پسندی کے باوجود "نقوش لطیف" میں احمد ندیم قاسمی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے قرۃ العین نے لکھا تھا کہ "اقدار اور جمالیات کی زندگی سے ہم آہنگی ہی صحیح ترقی پسندی ہے۔" قرۃ العین کے افسانوں اور ناولوں میں بعض آڑے ترچھے خطوط کے باوجود جو دل کشی، گرفت، ذہنی قوت، مطالعہ تاریخ اور وجود کی کشمکش شامل ہے، اس نے انھیں ادب میں بڑا مقام دیا ہے۔ اگرچہ احمد ندیم قاسمی نے لکھا تھا کہ "بورژوا طبقے کو ابھی مدتوں تک ان سے بہتر نمائندہ شاید ہی مل سکے۔" احمد ندیم قاسمی نے ترقی پسند تحریک میں نہایت فعال کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے ترقی پسندانہ تصورات کا دفاع کیا اور معترضین کو جواب بھی دیا ہے۔ خود اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے وہ اپنی تازہ کتاب "معنی کی تلاش" میں کہتے ہیں کہ "میں انسان اور اس کی زندگی کو فن کا بنیادی موضوع قرار دیتا ہوں۔ اگر انسان موجود ہے اور اس کرے پر زندگی موجود ہے تو پھر سب کچھ موجود ہے۔" اسے مان لیا جائے تو فن میں حیات آمیزی کے اسالیب میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹر شکیل الرحمن کی کتاب "احمد ندیم قاسمی... ایک لیجینڈ" قاسمی شناسی میں خصوصاً ان کے افسانوں کے حوالے سے ایک اضافہ ہے۔ اسے بھی فکشن کی تنقید کا ایک رویہ کہا جاسکتا ہے۔ عصمت چغتائی کے نام سے بھی ایک تیز مضمون قرۃ العین کے بارے میں شائع ہوا تھا۔ منٹو کو اپنے ادبی مرتبے کا جو احساس تھا، وہ بہت کم افسانہ نگاروں کے حصے میں آیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ فن افسانہ کی رموز دانی اور اپنے انداز نگارش کے اعتبار سے نہایت منفرد افسانہ نگار ہے، جس کے متعدد افسانے اردو افسانہ نگاری میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ افسانوی خیال، ہنرمندی اور زندگی پر گرفت راجندر سنگھ بیدی کی ایسی خصوصیت ہے کہ وہ بے بضاعت چیزوں کو بھی

ستقبل دیکھ لیتے ہیں۔ کرشن چندر کے افسانوں میں شاعرانہ تاثر ایک نئے بعد کا اضافہ کرتا ہے۔ یہی خصوصیت افسانوی بنت کے اضافے کے ساتھ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کا امتیاز ہے۔ شوکت صدیقی نے صحافتی جدوجہد کے پس منظر میں سماجی حقیقت نگاری کے خدوخال متعین کیے ہیں۔ بعض اہم لوگوں نے جن سے مغربی ادب اور خاص طور پر انگریزی ادب کے مطالعے کی وجہ سے وسیع النظری کی توقع کی جا سکتی تھی مگر یہ توقع پوری نہیں ہوئی ہے۔ مثلاً اسلوب احمد انصاری، انتظار حسین اور اگلی نسل میں مرزا حامد بیگ۔

فکشن میں سماجی اور تاریخی حقائق کا مطالعہ بھی اہمیت کا حامل ہے۔ تاریخ سے مراد صرف تاریخی ناول نہیں کیوں کہ ان کی جداگانہ حیثیت ہے۔ لیکن فکشن میں ناول خاص طور پر ہیئت اجتماعی کے متحرک اور مرکب عمل کو پیش کرتا ہے، جس میں سماجی اور تاریخی عوامل کا تجزیہ موجود ہوتا ہے۔ اس عمومی تاریخ کو سماجیاتی، تہذیبی، معاشیاتی اور سیاسی تاریخ کے کئی خانوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ اس کے باوجود افسانہ اور ناول کے اپنے تقاضے بھی ہوتے ہیں کہ ان کے بغیر تاریخی بیان فن کے قالب میں نہیں ڈھلتا۔ نسبتاً حال میں تاریخ کی متعدد قسموں نے فروغ پایا ہے۔ لیکن خود تاریخ بھی محض واقعات کا بیان نہیں۔ اس کے لیے بھی ایک تاریخی تصور کی ضرورت ہوتی ہے۔ جن کے یہاں یہ تصور موجود نہیں ہوتا، وہ ایک متن یا کئی متنوں کے حوالے سے واقعات بیان کرتے چلے جاتے ہیں اور انھیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اصل اہمیت کس واقعے یا کس بیان کو حاصل ہے؟ کیا نپولین کے ذاتی کوائف زیادہ اہم ہیں یا وہ وسیع تاریخی تناظر جسے محرک اسباب کہا جاسکتا ہے اور جسے ٹالسٹائی نے اپنے شاہکار ''حرب و صلح'' (War and Peace) میں پیش کیا ہے۔ اس ناول کا کارل پاپر (Karl Popper) نے اپنی کتاب The Poverty of Historicism (افلاس تاریخیت) میں ذکر کرتے ہوئے جہاں اس بات کی حمایت کی ہے کہ تاریخی تناظر صرف جابروں اور جرنیلوں تک محدود نہیں، بلکہ بے شمار لوگوں اور افراد تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے باوجود وہ تاریخی تناظر کو ختم کرنا چاہتا ہے اور پہلے سے تصور کردہ انتخابی نقطۂ نظر سے اس تاریخ کے لکھنے کو مقدم جانتا ہے، جس میں ہمیں دلچسپی ہو۔ (ص: ۱۵۱، ۱۹۵۷ء) لیکن جب ہم اپنی دلچسپی یا اقدار وتصورات کی بات کرتے ہیں تو یہ ضرور جان لینا چاہیے کہ ان سے انسان کے مستقبل اور اجتماعی بہتری پر کیا اثرات ہوتے ہیں؟ خود پاپر نے اپنی دوسری کتاب The Open Society and its Enemies میں اپنے سماجی اور سیاسی تصورات کو واضح کردیا ہے۔ ولیم ڈرے (William Dray) کی ایک کتاب Perspectives in History بھی لائق مطالعہ ہے، اس

جائزہ لیا ہے۔ جس میں کالنگ ووڈ (Colling Wood) کے فرد کی تاریخی خصوصیت، ٹائلر
(Taylor) کی دوسری جنگ عظیم کے آغاز اور اوسوالڈ اسپنگلر (Oswald Spingler) کے تہذیبوں
کے دائرہ حیات سے بحث کی ہے۔ لیکن تاریخی عمل ایک فرد کو نہیں، پورے عالم انسانیت کو متاثر کرتا ہے
اور عالم انسانیت کے تناظر ہی میں اس کا صحیح جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس کا آغاز اور نتائج دونوں
اہم بن جاتے ہیں۔ صرف یہ کہنا کافی نہیں کہ ہٹلر اپنے پیش رووں یا مغربی طاقتوں کے رہنماؤں سے
مختلف نہیں تھا اور اس کے اعمال حالات کی مجبوری کے نتائج تھے۔ جن میں اس کے ارادے کو زیادہ دخل
نہیں تھا۔ اس میں شک نہیں کہ پہلی جنگ عظیم کے نتائج کی نا انصافی اور مغربی استبدادیت کے عوامل
موجود تھے۔ (اقبال نے اس جانب اشارہ کیا ہے)۔ لیکن اس وقت جب نسلی برتری کا تصور پیش کیا
جارہا تھا اور یہودیوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو رہا تھا، ساری دنیا کے دانش ور نازی ازم کے خلاف تھے
(اگرچہ خلافت عثمانیہ کے زیر سایہ اس وقت بھی جب ساری دنیا میں یہودیوں پر مظالم ڈھائے جارہے
تھے، انہیں پناہ حاصل تھی) تاریخ کی ایسی توجیہات جو ظلم اور نا انصافی کو روا رکھیں، ناکافی ثابت ہوتی
ہیں۔ آج کے دور میں نازیوں سے سبق سیکھ کر یہودی فلسطینی عربوں پر جو مظالم ڈھا رہے ہیں ان کے
لیے بھی کوئی وجہ جواز نہیں (ملاحظہ ہوں قیصر تمکین کے کئی افسانے)۔ خود مہاتیر محمد کے ایک بیان سے
(جن کی مغربی زعما نے بڑی مخالفت کی) اس نئی تاریخی صورت حال پر روشنی پڑتی ہے۔ اس دور میں
صیہونیت پرستی (یہودیت ہرگز ہرگز مراد نہیں) صیہونی سرمائے کی کرشمہ سازی ہی کہی جاسکتی ہے۔

فکشن کی تنقید کے سلسلے میں اردو افسانوں میں اشتراکی رجحانات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔
نسبتاً وسیع تر تناظر میں مختصر افسانے کا سماجیاتی مطالعہ بھی ہوا ہے۔ ''جدید افسانہ، ہندی'' کا جائزہ بھی لیا
گیا ہے۔ اس سلسلے میں جدید عصری حسیت کے ساتھ ترقی پسند رجحان کو آگے بڑھانے والوں کا بھی ذکر
کیا گیا ہے اور اس گروہ کا بھی جس نے کہانی کو تجرید کے قریب لاکھڑا کیا ہے اور علامتی، تجریدی
کہانیاں ترسیل و ابلاغ کی فکر کے بغیر لکھی جارہی تھیں۔ افسانہ نگاروں نے پلاٹ، قصے، کردار جیسے عناصر
کو افسانے سے دور کردیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایک گروہ ایسا بھی ہے جس نے منٹو، کرشن چندر اور
بیدی کے کہانی کہنے کے فن سے استفادہ کرتے ہوئے، اپنی کہانیوں کو نکھارا ہے۔ گیان چند جین کا ایک
اقتباس قابل ملاحظہ ہے ''نفی کی اس رو نے اینٹی ہیرو، اینٹی افسانہ، اور اینٹی تھیٹر کو جنم دیا۔''
جدید لسانیات اور نشانیات کے جو اثرات مرتب ہوئے ہیں، ان کے جائزے کی بھی
ضرورت تھی۔ ڈاکٹر قاضی عابد نے ''اردو افسانے اور اساطیر'' کا تعلق علمی انداز سے دریافت کرنا چاہا
ہے۔ ایک افسانہ نگار کے بارے میں ان کا یہ بیان دیکھیے
''یہ فکری انتشار اور پرتشدد اسلوب

کہانی اور قاری کے درمیان بے رغبتی کے رشتے کو جنم دینے والی چیزیں ہیں۔" عموی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ آخر قاری اور کہانی کے درمیان رشتہ کیوں اور کیسے ٹوٹا؟ اس لحاظ سے کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ قاری اور کہانی کے درمیان جو فاصلے حائل ہوئے ان میں عالمی صورت حال کے پیدا کردہ انتشار کے ساتھ بعض علمی نظریات کی پریشان نظری کو بھی دخل ہے۔ ایک برتر سیاسی قوت اور اس کے حامیوں نے ایسے تصورات پیش کیے ہیں کہ انسانی ذہن انتشار میں مبتلا رہے اور ادب کی وہ تخلیقی قوت جو انقلابی قدر رکھتی ہے، اس کے پھیلے یا پھیلائے ہوئے انتشار میں دب کر رہ جائے۔

مثبت اہداف کے نہ ہونے، سامراجی سیاست کے پیچ در پیچ زاویوں کو نہ سمجھنے اور تہذیبی انتشار کے فروغ نے سابق مشرقی پاکستان پر دوسری ہجرت کا سلسلہ دراز کیا۔ جن پر بعض مغربی پاکستان کے موقر لکھنے والوں نے بھی قلم اٹھایا ہے لیکن ان سلسلۂ واقعات کو خاص طور پر مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے اردو کے ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں نے پیش کیا ہے۔ جن میں بہت سے اہم نام شامل ہیں۔ خود سابق مشرقی پاکستان میں اردو افسانہ نگاری کی ایک اہم روایت موجود تھی، جس میں کئی اہم نام شامل تھے۔ مشرقی پاکستان کے تقریباً سب افسانہ نگاروں کی خصوصیت زمین سے گہرا تعلق ہے۔ ان لکھنے والوں کے افسانوں اور ان کے لکھے گئے جائزوں میں اسی خصوصیت کی ترجمانی ملتی ہے۔ تفصیل کا موقع نہیں ہے۔

نشانیات اور لسانیات ایسے علوم ہیں، جنھیں عصرِ حاضر کے ادراک سے زیادہ دورِ حاضر میں ٹیکنالوجی کی ترقی نے فروغ دیا ہے۔ ان کے اثرات بھی فکشن کی تنقید کا ایک رخ ہیں۔ حافظ جب کہتے ہیں کہ: نیست در لوحِ دلم جز الف قامت دوست۔ چکنم حرف دگر یاد نہ داد استادم تو الف کی علامت معرفت و مجاز کے کئی سلسلوں پر حاوی ہے۔ لیکن اس کے تہذیبی نشانات کا ایک خاص دائرہ ہے۔ اب شکستِ دائرہ کی خواستگاری ہے۔ مشینوں کی ساخت سے دلچسپی اور انجن کھول کر اس کے نظام کا جائزہ لینے کی خواہش بھی علم ہی کا حصہ ہے اور اس میں کوئی خرابی نہیں۔ لیکن جب اسے جامع العلوم سمجھ لیا جائے اور زبان کے نظام کو معاشرے کے نظام پر فوقیت دینے ہی کی نہیں بلکہ اس پر مسلط کرنے کی کوشش کی جانے لگے، تو بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ لسانیات اور نشانیات جن پر ساختیات اور پس ساختیات کا مدار ہے، ادب کے مطالعے میں کارگر ثابت ہوسکتی تھیں اور ان سے ادبی مطالعے کے نئے زاویے سامنے آسکتے تھے، لیکن وہ ادب ہی نہیں انسانی فکر کی جگہ لینے کے درپے ہیں۔ ادب کی معاشرتی اور جمالیاتی خصوصیات اور زبان کی ساخت کی تعبیر (بلکہ تعبیرِ کل) ایک دوسرے سے مغائرت رکھتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ادب کا ذریعۂ اظہار الفاظ ہیں لیکن ادب اور خصوصاً شاعری کا فنونِ لطیفہ

سے بھی تعلق ہے۔ اس حقیقت اور حقیقت کے متوازی دوسری یعنی صناعی اور حقیقت کی شاخ سے پھوٹنے والی تمثال گری یا استعارہ آفرینی دونوں ایک دوسرے سے اس طرح پیوست ہیں کہ ان کو جدا کیا جائے تو معنوں کے زیاں کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ادب انسان کی داخلی اور خارجی زندگی دونوں سے واسطہ رکھتا ہے، جس میں بعض اوقات کشاکش اور تصادم کے اشاریے ملتے ہیں۔ ادب انسانی زندگی کے ایسے تجربات کا اظہار بھی ہے، جس میں زبان کے ارتقا کے مختلف مدارج سے کام لے کر (اور یہ مدارج معاشرے کے تاریخی ارتقا کا نتیجہ ہوتے ہیں) عمومی اور ہمہ گیر صداقتوں کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے زبان کی آمریت ادب پر مسلط کر دی جائے تو ادب کی جمہوریت کو خطرات لاحق ہو جاتے ہیں۔

ساختیات اور پس ساختیات کے نقطہ نظر سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ساختیات کے نظریہ سازوں اور پس ساختیات کے ذہنی رہ نماؤں کا بڑی حد تک مبسوط جائزہ لیا ہے۔ (اگرچہ کچھ اہم نام چھوٹ بھی گئے ہیں) کیسرر (Cassirer) نے "An Essay on Man" میں کہا تھا ''آرٹ کی تعریف علامتی زبان کی حیثیت سے ہو سکتی ہے۔'' چارلس ایس پیرس (Charles S. Pierce) نے ہر خیال کو ایک نشان کہا تھا۔ اس نے نشانات کی آفاقی اہمیت پر زور دیتے ہوئے ساری انسانی فکر کو نشان سے تعبیر کیا تھا۔ اس کے برخلاف مکاروو سکی (Mukarovsky) لفظ کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہتا ہے کہ زبان کا نشان لفظ ہے، علامت نہیں جو مادہ حقیقت کی جگہ لیتا اور اس کی تفہیم و تاثر آفرینی میں مدد کرتا ہے۔ یوری لوٹمین (Yuri Lotman) کہتا ہے کہ فکشن کی خود اپنی زبان ہوتی ہے سب فنون کی، ادب کی طرح خود اپنی زبان اپنے نشانات اور اپنی ترتیبات ہوتی ہیں جن کے ذریعے وہ اپنے پیغام کی وضاحت کرتے اور جن کو کسی اور طریقے سے ادا نہیں کیا جا سکتا۔ سب اپنی الگ زبان رکھتے ہیں۔ اگر اس نظریے کو مان لیا جائے تو ادب اور خود فنون لطیفہ میں انسان دوستی کا تصور مشکل ہو جاتا ہے کہ درد انسانیت انسان کا بنیادی احساس ہے۔ اگرچہ انسانی تاریخ میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں اور تاریخ صرف خط مستقیم میں حرکت نہیں کرتی۔ وہ نظریات جو ادب کی تفہیم یعنی اس کی جمالیاتی اور انسانی خصوصیات کا تعین نہ کر سکیں اور جن میں ایک متن کو دوسرے متن پر ترجیح دینے کی راہ نہ نکلے، ادب کے سمجھنے میں زیادہ کارگر ثابت نہیں ہو سکتے۔ زبان کے حوالے ہی سے کبھی شوکت صدیقی، راجندر سنگھ بیدی یا منٹو اور ابن صفی کا نام ایک ساتھ لینا ادبی جرم کے مترادف ہے۔ نشانیات کے مفکروں کے اکثر بیانات تضادات کے حامل ہیں اور ایک دوسرے کی تکذیب کرتے ہیں۔ زبان اور ادب کو ایک سمجھنا ساختیات کا بڑا عیب ہے۔ ادب کے جمالیاتی نشانات میں جذبہ احساس اور ادراک سب شریک ہوتے ہیں (ان میں حال اور مستقبل کا ادراک دونوں ضروری ہیں)۔ پھر جمالیاتی نشانات سب کے سب

علامات نہیں ہیں۔ ادب کے ادراک میں سیاست، اقتصادیات، محنت و سرمائے کی کشمکش اور اب یک قطبی دنیا کی حقیقت سب کے نقوش ملتے ہیں اور انسانی تاریخ کا شعور رہنمائی کرتا ہے۔ کیا یہ جاننے کی ضرورت نہیں کہ تجارتی سرمایہ داری، مالیاتی سرمایہ داری میں کیسے تبدیل ہوئی اور اب بین الملکتی و شرکتوں کی طاقت کے کیا فوائد ہیں!

سوسیئر کو جدید ساختیات کا امام کہا جاتا ہے لیکن یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس کے شاگردوں کے نوٹس ۱۹۱۶ء میں تیار اور شائع ہوئے۔ ان کا انگریزی ترجمہ ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ اگرچہ علمی حلقوں میں اس کی شہرت پہنچ چکی تھی۔ شاید اسی لیے گولڈے لیئر (Goldelier) نے اس سے پہلے مارکس کو اس کا بانی قرار دیا ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ ساخت کو نظر نہ آنے والے رابطوں کے ساتھ خلط ملط نہیں کرنا چاہیے اور وہ ان کے مخفی رابطوں اور ان کے پیچھے چھپی ہوئی منطق کی تشریح کرتا ہے۔ (Structure and Contradiction in Capital) لیکن مارکس نے نہ مادی حقیقتوں کو نظر انداز کیا تھا، نہ ارتقائے تاریخ سے روگردانی کی تھی اور نہ معاشرے پر زبان کے نظام کو مسبوط کرنا چاہا تھا۔

اب پس ساختیات کے سیلاب میں جب سارے کلیے اور سارے اقدار ٹوٹ پھوٹ کر رقیق و سیال بن جائیں تو ادب کی وہ باقی رہنے والی خصوصیات جن کی وجہ سے ادیب القدماء نے آج تک فکر و نظر کی شمعیں روشن ہوتی رہی ہیں رفتہ رفتہ سب بجھنے لگتی ہیں۔ ان کا انسانی تاریخ اور ہماری فکری مدار یا مجموعی طور پر انسانی دانش سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ سامراجیت اور بالاتر میں طاقت آج تاریخ کا اہم عنصر ہے لیکن تاریخ ہی موجودہ تضادات سے نئی تاریخ کی تشکیل بھی کر رہی ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی نہج سے ترجیح اقدار کے قائل ہوتے ہیں۔ وہ نہ بیانیہ یا مہابیانیہ کو رد کرتے اور نہ حقیقت نگاری یا ترقی پسندی کے خلاف محاذ آرائی کرتے ہیں۔ ان کی کتاب ایک علمی بیان ہے، جس سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ البتہ بعض افسانوں کی ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے جس طرح مدح سرائی کی ہے اسے کثیر المعنویت سے زیادہ قاری اساس تنقید کا کرشمہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے فکشن کی شعریات اور ساختیات کا ایک باب قائم کیا اور قاری اساس تنقید کو چھ زمروں میں تقسیم کیا ہے۔ جن میں ایک زمرہ تاریخی، عمرانیاتی بھی ہے۔ لیکن کسی ادبی فکر کے نہ سارے تصورات و تمثیلات، متن کی موج کہے جا سکتے ہیں اور نہ ان کے گرد متن کا حصار کھینچا جا سکتا ہے۔ پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ گنجینۂ معنی کا طلسم غالب کی خصوصیت ہے، داغ دہلوی کی نہیں۔ فیض نے روایتی معنوں کو نئی وسعت دی ہے لیکن اسے فیض کی مجموعی فکر سے غیر منسلک نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح تاریخ کا ایک تصور وہ بھی ہے، جو انسان کے اس کرۂ زمین پر مستقبل سے وابستہ

ہے۔ پس ساختیات کے اکثر حامیوں نے تو صرف مصنف ہی نہیں خود انسان کو وہم بنا دیا ہے اور ان میں سے اکثر کے بارے میں مخالف انسان ہونے کا الزام صحیح معلوم ہونے لگتا ہے۔ کیا ٹیکنالوجی کی ترقی سے انسان اور مشین میں کوئی فرق باقی نہ رہ جائے گا؟ (ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت۔ احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات۔ اقبال) کیا مابعد جدیدیت کے ثقافتی مکالمے کو ثقافتی خلفشار کی صورت کہا جا سکتا ہے۔ دیوندر اسر نے اپنی کتاب ''نئی صدی اور ادب'' میں اس سے بحث کی ہے اور کتاب کے آغاز ہی میں مشل فوکو کا ایک قول نقل کیا ہے کہ ''سمندر کے کنارے بنائے گئے چہرے کی طرح انسان کا نشان مٹ جائے گا۔'' البتہ فوکو نے علم، سائنس، ٹیکنالوجی اور اقتدار کو ایک دوسرے سے مربوط پایا ہے۔ مارکس اور نطشے سے فکر کی مختلف سطحوں پر متاثر ہوا ہے۔ وہ عہد حاضر کی تاریخ لکھتے ہوئے علم اور اقتدار کے ایک طریقے سے دوسرے طریقے تک نظریں دوڑاتا ہے لیکن انسان اور زیادہ انسانی فلسفیانہ افکار کے نظاموں سے زیادہ سروکار نہیں رکھتا۔ اسی لیے بعض نے اس کی فکر کو تعقل پسندی اور دیوانگی کے درمیان ایک ٹوٹنے ہوئے مکالمے سے تعبیر کیا ہے۔ ادب کا صرف ایک کوڈ ہے اور وہ ہے زندگی اور اس کے متنوع جلوے۔

نشانیات میں ادبی متون کے ساتھ ساتھ ٹی وی شو، فیشن شو، چہرے کے تاثرات اور کھانا پکانا سب شامل ہو جاتے ہیں۔ دریدا (Derrida) خاص طور پر نظام خیال کی آفاقی سچائیوں، صداقت، خیر اور حسن سے خصوصیت رکھتا ہے۔ وہ مرکزیت خیال کے خلاف ہے۔ اس کے لیے زبان غیر مستقل اور بے ثبات ہے۔ وہ ایک ایسے تھیٹر کا تصور پیش کرتا ہے جس میں گفتگو اسٹیج کی حاکم نہ رہے گی اور جہاں مصنف یا ٹیکسٹ کو اقتدار حاصل نہ ہوگا اور نہ تاریخ باقی رہے گی۔ (Without History)۔

اس لیے کہ مارکس کو بھی بانیان ساخت میں شامل کر لیا گیا ہے اور اس لیے بھی کہ مفکران نشانیات میں سے بعض نے مقتدر طبقے کے خلاف آواز بلند کی ہے، ساختیات یا توسیع ساختیات کو بعض بیرونی ہمنوا بھی مل گئے۔ گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب پوری محنت اور علمی تلاش سے لکھی ہے۔ لیکن نہ انھوں نے ترقی پسند تحریک کے خلاف کوئی محاذ قائم کیا اور نہ ادبی فکر کے طور پر ترقی پسندوں کے مخالف رہے۔ شمس الرحمن فاروقی کا کلاسیکی ادب کا مطالعہ ہے لیکن جانے کیوں اکثر کم ارزش اشعار ان کے حافظے میں محفوظ رہتے ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی ''افسانے کی حمایت میں'' کہتے ہیں کہ ناول کے دوبارہ احیا کے بعد افسانے کی وقعت پہلے سے بھی کم ہوگئی ہے۔ حالانکہ واقعہ دونوں سے الگ الگ اصناف ادب ہیں اور دونوں کے فنی تقاضے بھی مختلف حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر وہ اردو ادب میں ناول اور افسانے کے باقاعدہ وجود سے بھی منکر ہو جاتے ہیں۔ ان کے اس نوع کے خیالات پر

ناصر بغدادی نے بھی گرفت کی ہے۔ شمس الرحمن فاروقی سماجی حقیقت نگاری کے بھی خلاف ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی سماجی حقیقت نگاری سے قطع نظر کہ وہ ان کا میدان نہیں، شمس الرحمن فاروقی نے تاریخ اور ادبی تاریخ کو "سوار" میں تہذیبی دستاویز کے طور پر پیش کیا ہے۔ لیکن وہ مدرسہ رحیمیہ کو تاریخی تناظر میں پیش کرنے سے قاصر رہے۔ (ملاحظہ ہو احمد زین الدین کے رسالے "روشنائی" کا شمس الرحمن فاروقی نمبر جس میں میرا مضمون "سوار اور شہسوار")۔ اس سے بہر حال انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شمس الرحمن فاروقی کا ادبی مطالعہ (بشمول داستانیں) بہت وسیع ہے اور اختلافات کے باوجود انھیں اردو تنقید کا ایک اہم نام کہا جا سکتا ہے۔

فکشن کی شعریات ایک بے جوڑ اصطلاح ہے لیکن اردو میں فکشن کی تنقید کے اصولوں کے سلسلے میں رائج ہو چکی ہے۔ ہمارے فکشن پر لکھنے والوں نے جس طرح مغربی خیالات سے استفادہ کیا ہے، اس طرح دیگر مسلم ممالک جیسے مصر، ترکی، ملائیشیا اور انڈونیشیا کے فکشن لکھنے والوں یا فکشن کے تنقیدی خیالات کی طرف متوجہ نہیں ہوئے ہیں۔ اسی طرح خود ہندوستان اور پاکستان میں مختلف علاقوں یا خطوں کی تحریروں کو اس طرح پیش نہیں کیا، جس طرح پیش کیا جانا چاہیے تھا۔ خود ہندی میں فکشن کے نئے تجربات کا سلسلہ جاری ہے اور جنوب میں دراوڑی زبانیں بھی ایسی خصوصیات رکھتی ہیں کہ ان کے ترجموں سے فائدہ ہو سکتا ہے اور یہ دونوں ملکوں یعنی پاکستان اور ہندوستان کے لیے مفید ہے۔ مثلاً جنوبی ہند کی زبان تامل اور سندھ کی براہوی زبان میں جو کچھ لکھا گیا ہے، ہم اس سے تقریباً ناواقف ہیں۔ یہی حال افریقہ اور لاطینی امریکہ کی فکشن کا بھی ہے۔ مگر ہم جدیدیت یا مابعد الجدیدیت کے پھیر میں ایسا پڑ گئے ہیں کہ ان لازوال خزانوں کو فراموش کر دیا ہے۔

اردو میں فکشن کی تنقید شاعری کے مقابلے میں کم ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیوں کہ شاعری کی روایت فکشن کے لحاظ سے زیادہ قدیم اور زیادہ مضبوط رہی ہے مگر فکشن کی تنقید کا میدان خالی ہرگز نہیں رہا ہے۔ اب فکشن کی طرف زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔ ہمارے سینیئر لکھنے والوں میں سے متعدد نے فکشن پر اپنے تنقیدی خیالات پیش کیے ہیں۔ ان میں کشن پرشاد کول، عزیز احمد، آل احمد سرور، احتشام حسین، ڈاکٹر گیان چند جین، وقار عظیم، ڈاکٹر احسن فاروقی، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، قاضی عبدالودود، مولوی عبدالحق، عبدالقادر سروری، علی عباس حسینی، مولانا صلاح الدین احمد، مجنوں گورکھ پوری، محمد حسن عسکری، ممتاز شیریں، ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر قمر رئیس جیسے ادبی مشاہیر شامل ہیں۔ پریم چند سے صرف جدید افسانوی روایت ہی کا آغاز نہیں ہوا، فکشن کی تنقید بھی ان کی تحریر سے خالی نہیں رہی۔ ترقی پسند تحریک نے اردو افسانے کے بڑے ناموں کے ساتھ ساتھ فکشن کی تنقید کو بھی

فروغ دیا۔ لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ترقی پسندانہ فلسفے یا نظریے کے نمونے نئے دور کے لیے کافی ہیں یا ہمیں نئی دانش کی بدلتی ہوئی صورت حال کے لیے نئے نظریے کی ضرورت ہے!

ادبیات عالم کا (جس حد تک توفیق ہوئی ہے) مطالعہ کیا جائے اور مختلف ادبیات کی خصوصیات کا جائزہ لیا جائے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ حقیقت کی نئی نئی طرح کی مصوری اور نئے معنی ادب دونوں کی خصوصیت رہی ہے۔ یعنی الف لیلوی کہانی ہو یا ہومر اور تخلیق سب میں پیار، انسان کی تلاش اور خیر کی جستجو کے آثار ملتے ہیں۔ لیکن جیسے موسیقی اور مصوری میں حقیقت کا اظہار مختلف جمالیاتی نشانات رکھتا ہے، اسی طرح انسانی تاریخ کے ارتقا کے ساتھ، حقیقت کی شکلیں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ جنھیں ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ پھر بھی ادب میں انسانیت کا درد مشترک ادب کو ہمہ وقتی اور عمومی حیثیت دیتا ہے۔ مگر اس عمومی حیثیت سے وابستہ وہ تاریخی تناظر بھی اہم ہوتا ہے، جس میں کسی دور کا ادب تخلیق کی منزلوں سے گزرتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے توقیت پاتے ہیں۔ پھر یہ تاریخ صرف تاریخ نہیں ہوتی بلکہ تخلیق لکھنے والے کے احساسات و اضطرابات کا آئینہ بھی ہوتی ہے۔ اس میں انسان کے بہتر مستقبل کی فکر بھی کارفرما رہتی ہے۔ محض تاریخ کے بیان سے شاید تاریخ تو پیدا کیا جا سکتا ہے۔ تاریخ کی اصلیت تک رسائی نہیں ہوتی۔ پھر چاہے کتنے ہی تہذیبی تناظر کا تانا باندھ دیا جائے، حقیقت تاریخ تک رسائی نہیں ہوتی۔ اسی لیے یہ بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ ہر دور کا جائزہ لیتے ہوئے، تاریخ کے پس منظر ہی نہیں، اس کے بلند ترین نشان کو بھی سامنے رکھا جائے۔ اسی لیے غالب، سرسید، اقبال اور پریم چند دوسرے لکھنے والوں کے مقابلے میں اہم بن جاتے ہیں اور ان سے روگردانی کو ترقی معکوس کہا جا سکتا ہے۔ طرز کہن پر اڑنے کی بات اقبال نے بھی کہی تھی، لیکن ان کی شاعرانہ فکر میں برصغیر کی آزادی کی جدوجہد کئی منزلیں طے کر چکی تھی۔ اس میں جو تازہ کاری ملتی ہے، وہ اکبر کے قدیم تہذیبی نشانات کے حوالوں سے مختلف ہے۔ اسی طرح فراق کے کلام کی تہ داری کو سمجھنے کے لیے تاریخی تناظر اور جمالیاتی جدلیات دونوں کے مطالعے کی ضرورت ہے۔ اردو کے اہم لکھنے والوں نے جو سرمایہ بہم پہنچایا ہے، وہ ایسا روشنی کا نشان ہے جو آنے والی نسلوں کو بھی نور فراہم کرتا رہے گا۔

اب دنیا بہت بدل چکی ہے۔ یک قطبی دنیا کی صورت حال میں اقدار و تصورات کی جنگ تیز تر ہوگئی ہے۔ ایک جانب دنیا کے سارے وسائل پر قبضہ کرنے کی ہوس اقتدار ہے اور دوسری جانب ہمیشہ کی طرح انسان استبداد کی نئی صورتوں کے خلاف اپنی پوری قوتوں سے صف آرا ہے۔ ان قوتوں میں فن بھی ایک بڑی قوت ہے۔ انسانی ذہن کو انتشار اور انفعال کی جانب مرکوز کرنے کے لیے بڑی سوچی سمجھی کارروائی ہو رہی ہے اور علم و دانش کے حربے بھی آزمائے جا رہے ہیں۔ ایسی صورت میں

صرف ترقی پسند تحریک کو پیدا کردہ نمونے ہمارے لیے کافی ہوں گے۔

شاید ہمیں انسانیت کے دردِ مشترک میں نئے جمالیاتی معیار قائم کرنا ہوں گے اور علم و دانش کو نئے خطوط پر استوار کرنا ہوگا۔ ایسے معیارات اور ایسی دانش جو مشرق و مغرب یا شمال اور جنوب کی تفریق کے بغیر، انسان کے فکری و جمالیاتی ورثے سے قوت پاتے ہوئے، اس نئے تاریخی تناظر میں نئے معانی کی جستجو کر سکے۔ اس کے نشانات نمایاں ہو چلے ہیں۔ تاریخ کی مختلف منزلوں میں دردِ انسانیت دیرپا قدر رہی ہے۔ یہ وہ زمرہ ہے جو انسان دوستی سے مربوط ہے۔ حافظ کہتے ہیں کہ

عاشقاں زمرۂ ارباب امانت باشند
لاجرم چشم گہربار ہمانست کہ بود

یہ انسان دوستی ہی ہے جو آج کے حالات میں بھی تہذیبوں کے تصادم، مذہبی اور فرقہ وارانہ تعصب اور شدت پسندی سے نجات دلا سکتی ہے۔

٭٭٭٭